R. N. [illegible]

Regd. No. [illegible]

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Tele. No. 29

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۱، شمارہ ۱۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ اپریل ۱۹۶۳ء

محمد انصار اللہ نظر

کلامِ ذوق میں الحاق

تحقیق کا کام اس وقت اور بھی اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات میں الحاق کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ الحاق عموماً درجہ اول کے فن کاروں کے یہاں ہی ہوتا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں جن پر ہمیں نگاہ رکھنا ضروری ہے، مثلاً خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق ہی کے دیوان کو لے لیجیے۔ اس میں بھی الحاق ہوا اور ہر طرح ہوا۔ اس میں ہمیں الحاق کی مختلف صورتوں اور وجہوں کی دریافت میں آسانی ہو سکتی ہے۔

ذوق کی ابھی ابتدا تھی، لیکن تیز طبع تھے خوش فکر تھے، اچھے شعر کہتے تھے، استاد نصیر سے مشورہ کرتے تھے۔ استاد نصیر لکھنؤ گئے ساتھ میں ان کے فرزند شاہ وجیہ الدین منیر بھی تھے، مصحفی سے ملے، دونوں نے اپنا کلام مصحفی کو سنایا ہوگا، شعر پسند آئے مصحفی کے حافظہ میں محفوظ ہو گئے، تذکرہ لکھتے وقت مصحفی نے منیر کا ذکر بھی کیا، تعریف کی اور کہا کہ "جوان خوش فکر است" اور ایک مطلع لکھ دیا ؎

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

(ریاض الفصحا ص ۳۱۹)

اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ مطلع خود منیر نے مصحفی کو سنایا تھا یا کسی اور ذریعے سے مصحفی تک پہنچا اور منیر کا خیال ان کو رہا، انھوں نے ان ہی کے نام سے لکھ دیا۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ ذوق سے مصحفی واقف نہ تھے ورنہ ذکر ضرور کرتے۔ یہ امر مسلم ہے کہ یہ مطلع ذوق کا ہے تمام تذکرے اور انتخابات اس پر شاہد ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کے اشعار بھی پڑھ کر داد طلب ہوتے ہیں۔

سلاست ذوق کے کلام کا جوہر ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ انھوں نے میر سے تاثر لیا اور خود تو وہ یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ یاروں کو میر کا طرز نصیب نہیں ہوا گویا خود انھیں میر کے انداز کا شعر کہنے کا ملکہ ہے۔ یہ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ میر اور ذوق میں کوئی نہ کوئی مناسبت ضرور ہے شاید یہی سبب ہوا کہ خواجہ فخر الدین سخن نے اپنی داستان میں ذوق کے نام سے ایک شعر یہ بھی لکھا۔

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بے چارہ سینہ چاک گریباں دریدہ تھا

(سروشِ سخن)

لیکن میر حسن کا تذکرہ جو ذوق کی پیدائش سے پہلے مکمل ہو چکا تھا اس میں یہ شعر میر تقی میر کے نام سے درج ہے (ص ۱۵۳) البتہ دوسرے مصرعہ میں "سینہ چاک" کے بجائے "گریہ ناک" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر ذوق کا نہیں ہو سکتا، لیکن یہ داستان پڑھنے سے لگتا ہے کہ اس میں سخن کی نیت بہر حال اچھی ہی تھی۔

آزاد لکھتے ہیں کہ ذوق کی غزلیں "گلدستے" ہیں اور اگر یہ صحیح ہے تو شاعری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ پھر تو ہر شاعر کا کلام یہاں کھپ سکتا ہے۔ دیکھیے آزاد کا شعر تھا:

آخر گل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچے وہاں ہے خاک جہاں کا خمیر ہو

یہ شعر دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں اس طرح آ دبکا:

آخر گل اپنی خاک درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اسی طرح دیوان ذوق میں آزاد نے یہ دو شعر بھی لکھے ہیں:

ناقص کا سوا کینش سے مطلب نہ بر آئے
جو کور ہو عینک سے اُسے کیا نظر آئے

فردوس میں ذکر اس لب شیریں کا گر آئے
پانی دہن چشمۂ کوثر میں بھر آئے

کوئی شک نہیں کہ یہ اشعار "مولوی وضع" ذوق ضرور کہہ سکتے تھے، لیکن اسے کیا کیجئے کہ خود آزاد ہی نے ان دونوں اشعار کو آب حیات (صفحہ ۲۹۶ پر) جرأت کے نام سے لکھا ہے۔ اگر آزاد کی نیت کا خلوص تسلیم کیا جائے تو اس سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ... "حافظہ ندارد"

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی شاعر ایک ہی زمین میں شعر کہتے ہیں، ان ہم طرح غزلوں میں کچھ شعر ہمیں پسند آجاتے ہیں، چونکہ یہ اچھے ہوتے ہیں اس لئے فطری طور پر ہم ان کو اچھے شاعر کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذوق اور ظفر دونوں نے ایک طرح میں غزل کہی میرزا قادر بخش صابر کو یہ شعر پسند آیا:

ہم نے اس بت میں جو دیکھا ہے نہیں کہہ سکتے
کہ مبادا کہیں سن پائیں شریعت والے

میرزا صاحب نے اسے استاد ذوق سے منسوب کر دیا، اور اپنے تذکرہ میں ان کے اشعار کے ساتھ لکھ دیا حالاں کہ یہ شعر ذوق کی غزل کا نہیں ہے۔ ظفر کے کلیات میں آج بھی موجود ہے۔

شعر کہنے کے لیے کبھی کبھی شاعر کسی دوسرے استاد کا کوئی مصرعہ یا شعر لے لیتا ہے اور اس پر غزل کہتا ہے۔ مثلاً ناسخ کی ایک غزل پر شعر کہنے کے لئے شاید ذوق نے ان کا ایک مطلع لیا۔

سرو عاشق ہو گیا اس غیرت شمشاد کا
غل مچایا قمریوں نے بھی مبارک باد کا

آزاد نے دیوان ذوق مرتب کیا، انھوں نے اس مطلع کو بھی استاد ذوق کی غزل میں شامل کر لیا، اس کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں، ذوق اور ظفر دونوں نے ایک طرح میں غزلیں کہیں، غلطی یہ ہوئی کہ ذوق کا مطلع سرور نے ظفر کے نام سے لکھ دیا۔

نعل شکل مہ تو جب ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پہ مہ روشن کو لگے

(تذکرہ سرور صفحہ ۱۴۱)

بعد میں یہ غلطی گلشن بے خار سے ہوتی ہوئی گلستان بے خزاں تک پہنچی، لیکن ایک مدت کے بعد دیوان ذوق کے مرتبین نے متفقہ طور پر اسے ذوق ہی کے دیوان میں لکھ لیا، اسی طرح یہ شعر گلشن بے خار میں ظفر کے نام سے لکھا گیا۔

چار ٹکڑے کرد دل کے کہ نہیں ہو سکتا
لب کو دوں رخ کو نہ دوں، زلف کو دوں تل کو نہ دوں

صہبائی نے شاید سب سے پہلے یہ لکھا کہ "یہ شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ کا شعر ہے"۔

(رسالہ قواعد صرف و نحو اردو صفحہ ۱۳۱)

اور اس طرح اس الحاق کا پتہ چلا، تمام مرتبین دیوان ذوق نے بھی اسے ذوق کا مانا ہے۔

استاد اور شاگرد کا تعلق بھی دل چسپ ہوتا ہے استاد اکثر شاگرد کو شعر کہہ کر دے دیتا ہے۔ ذوق نے بھی یہ کیا، انھوں نے ایک غزل ظفر کو دی جس کا ایک شعر یہ ہے:

اُٹھائے سوز غم ہر نقطہ میں یہ خون کے دعوے کوئی غلط ہیں
کہ مثل خط گیر خط پہ خط ہیں ہنوز باقی ہرا ستخواں پہ

آزاد کہتے ہیں جب بادشاہ کا دیوان آیا تو والد نے اس غزل کو بھی اس میں دیکھ کر افسوس کیا۔ (دیوان ذوق صفحہ ۱۱) دیوان وغیرہ سے یہ غزل دیوان ذوق میں نہیں پہنچی، یہ جرأت بھی شاید آزاد ہی نے پہلے کی، صہبائی کو اس غزل کے دے ڈالنے کا علم شاید نہیں تھا۔ انھوں نے شعر مذکور کو رسالہ قواعد صرف و نحو اردو میں دو مرتبہ نقل کیا اور کہا کہ "شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ کا شعر"۔ (صفحہ ۷۵، صفحہ ۱۰۳) اس قسم کی باتیں اکثر استاد و شاگردوں کے درمیان مل سکتی ہیں۔

——— لیکن ——— یہاں تک الحاق کی صرف وہ صورتیں سامنے آئی ہیں جن میں بہر حال خلوص نیت شامل حال ہوتا ہے، اس سے زیادہ خطرناک صورت وہ ہوتی ہے جب عمداً ایسا کام کیا جائے، اس کی مثال بھی دیکھ لیجئے۔ آزاد نے ایک طویل تمہید کے بعد دیوان ذوق میں دو شعر لکھے کہ یہ استاد کے "لڑکپن بلکہ بچپن کے ہیں اور ایک مجہول آدمی نے ان کو سنائے تھے خود استاد نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ یہ شعر ان ہی کے ہیں۔ سنئے:

نامۂ شوق کو مرے باندھے جو تو نے بال پہ
کیوں ارے مرغ نامہ بر تجھ کو ہوئے وبال پہ

مصحف روئے یار میں دیکھا ہے تو جو خال پہ
لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم ایک چنے کی دال پہ

(صفحہ ۱۱۳، صفحہ ۱۱۴)

(باقی صفحہ ۷ پر)

ہماری زبان

۲۲ اپریل ۱۹۶۳ء

سہ لسانی فارمولا

ریاستوں کے وزرائے تعلیم کی ایک کمیٹی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ تمام ریاستوں کو سہ لسانی فارمولا ایک ہی ڈھنگ سے نافذ کرنا چاہئے ہاں مقامی حالات کی روشنی میں کچھ تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں اُردو دوستوں کے لئے سب سے اہم خبر یہ ہے کہ کمیٹی کی رائے میں تیسری زبان کوئی جدید ہندوستانی زبان ہونی چاہئے اور کسی کلاسیکل زبان کو کسی جدید ہندوستانی زبان کے بدلے نہیں پڑھانا چاہئے۔ کمیٹی نے خاص طور سے اس بات کی سفارش کی ہے کہ کم سے کم تین سال مسلسل ایک زبان پڑھانا چاہئے اور جہاں جہاں موجودہ انتظامات اس سلسلے میں کافی نہیں ہیں وہاں جلد سے جلد ایک جدید ہندستانی زبان کو لازمی طور پر پڑھانے کے لئے اقدام کرنا چاہئے۔ کمیٹی نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح اُن ریاستوں میں جہاں ہندی سرکاری زبان نہیں ہے، ہندی پڑھانے کے لئے امداد دی جاتی ہے اسی طرح ہندی ریاستوں میں لازمی طور پر کوئی جدید ہندستانی زبان پڑھانے کے لئے سو فی صدی تک امداد سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

ان سفارشات سے کئی باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ اوّل تو کوئی کلاسیکل زبان مثلاً سنسکرت یا عربی تیسری زبان کے طور پر نہیں لی جاسکتی۔ دوسرے کسی جدید ہندستانی زبان کو لازمی طور پر پڑھانا چاہئے اور اس کے لئے سو فی صدی مدد دی جانی چاہئے۔ تیسرے یہ کہ جنوبی ہند کی کسی زبان کو تیسری زبان کے طور پر پڑھانا لازمی نہیں۔ اُردو بھی تیسری زبان کے طور پر پڑھائی جاسکتی ہے۔

اگر ریاستی حکومتیں اس سفارش کو مان لیں تو اردو دوستوں کی بڑی تشویش دور ہو جائے گی۔ انھیں یہ خطرہ تھا کہ ہندی ریاستوں میں یا تو بھارتی سنسکرتی کے نام پر سنسکرت کو لازمی کر دیا جائیگا یا قومی یکجہتی کے نام پر جنوبی ہند کی کوئی زبان رکھی جائے گی۔ غریب اُردو کا نام نہ آنے پائے گا۔ مگر اس سفارش کے بعد سنسکرت کو شامل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے ہی لی جاسکے گی۔ اسی طرح یہ بھی لازمی نہیں رہتا کہ جنوبی ہند کی کوئی زبان ضرور پڑھائی جائے۔ اردو بھی پڑھائی جاسکتی ہے۔

اُتر پردیش کے وزیر تعلیم اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اُن سے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ اپنی ریاست میں اس سفارش کی پوری پابندی کریں گے اور اس طرح ثانوی تعلیم کی منزل پر اُردو دوستوں کو ہندی اور انگریزی کے ساتھ اپنی مادری زبان پڑھنے کا بھی موقع ملے گا۔ نیز وہ طلبا جن کی مادری زبان ہندی ہے، چاہیں تو اُردو بھی لے سکیں گے۔ پچھلے سال تو ایسا نظر آتا تھا کہ یا تو سنسکرت لازمی طور پر پڑھائی جائے گی یا جنوبی ہند کی کوئی زبان۔ اُردو اس فارمولے میں نہ آسکے گی۔ مگر ان سفارشات کے بعد مطلع صاف ہو گیا ہے۔ خیر

اُس کو بھولا نہ چاہئے کہنا صبح جو جائے اور آئے شام

ہمیں اس سفارش پر عمل درآمد کا بے چینی سے انتظار ہے۔

سیر بین

ہماری جمہوریت میں وزیروں کی اتنی اہمیت ہو گئی ہے کہ کوئی کام جو اُن کے بغیر پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی مشاعرہ ہو، کوئی نمائش ہو، انجینیروں کا اجتماع ہو، ادیبوں کی کانفرنس ہو، اُس کا افتتاح کسی وزیر سے کرایا جائے گا۔ خدا جانے وزیروں کے پاس اتنا فالتو وقت کہاں سے آجاتا ہے۔ اگر حساب لگایا جائے تو ہر وزیر سال بھر میں دو تین سو ایسے جلسوں میں ضرور شرکت کرتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ پورے وقت جلسے میں موجود رہے۔ وہ اپنی تقریر کر کے اطمینان سے رخصت ہو سکتا ہے۔ یوں سائنس اور ادب کی حکومت بڑی ہمت افزائی کرتی ہے۔ مگر ان سائنسدانوں اور ادیبوں کو بھی پیدا کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔

مشاعروں کا حال اور بھی عجیب ہوتا ہے۔ ایک وزیر افتتاح کرتا ہے، دوسرا صدارت۔ افتتاح کرنے والا گھنٹے آدھ گھنٹے کے بعد رخصت ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار جاتے ہوئے صدر کو بھی ہمراہ لے لیتا ہے۔ اب اگر وہاں کوئی نائب وزیر موجود ہوا تو صدارت کی ذمہ داری اطمینان سے اسے سونپ دی جاتی ہے۔ اگر بد قسمتی سے کوئی نہ ملا تو کسی پرانے ادیب یا شاعر کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ وہ غریب اسی بات پر خوش ہو جاتا ہے کہ مشاعرہ ختم اس کی صدارت میں ہوا۔ اب اس کا کیا ذکر کہ اس وقت سامعین کی تعداد کیا ہوتی ہے۔

ایک وزیر سے دو شکار کرنے کا یہ دستور کچھ ایسا مستحکم ہو گیا ہے کہ دہلی کے ایک مشاعرے میں جب لال بہادر شاستری نے ایک مشاعرے کا افتتاح کیا اور اسی کی صدارت بھی کی تو یہ ویسی ہی خبر تھی جیسی کسی کے سر میں دو سینگ نکل آنے کی ہو۔

مشاعروں کی بات نکل آئی ہے تو چند سال پہلے کا ایک واقعہ سن لیجئے۔ جشن جمہوریت کے سلسلے میں دہلی میں مشاعرہ تھا۔ دوسرے دن کچھ شاعروں کو اطلاع دی گئی کہ راشٹرپتی بھون میں ایک مخصوص صحبت ہوگی جس میں کچھ ہندی کے کوی اور کچھ اُردو کے شعرا بلائے جائیں گے۔ جب سکندر علی وجد اور راقم السطور وہاں پہنچے تو بقول ڈاکٹر ضیاء الدین دس بارہ "متنفس" بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں نہایت ادب سے سر جھکائے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم بھی تھے۔ بڑی بے تکلفی سے گیت سے اس محفل کا آغاز ہوا۔ صدر جمہوریہ کی موجودگی کی وجہ سے کچھ ایسا ماحول تھا کہ داد دینا بھی بے ادبی میں شامل تھا۔ غرض حال یہ تھا کہ ایک کوی آیا، اس نے اپنا پاٹھ سنایا، اس کے بعد ایک شاعر نے اپنا سبق پڑھا اور خاموشی سے اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ کوئی پون گھنٹے میں دس بارہ کوی اور شاعر کام آگئے۔ اس کے بعد چائے کی میزوں کی طرف سب منتقل ہو گئے اور تب جا کر اس ماحول میں کچھ زندگی پیدا ہوئی۔

حکومت کا فرض ہے کہ ادب، سائنس کی سرپرستی کرے، مگر ادب، سائنس کے فروغ کے لئے جس کھلی فضا کی ضرورت ہے وہ ان بڑے لوگوں کے سائے میں ممکن نہیں۔ برگد کے درخت کے نیچے ننھے ننھے پودے پنپ نہیں سکتے۔ ان کو دھوپ اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ وزیروں اور افسروں اور لکھپتی تاجروں کو شاعروں، ادیبوں اور سائنس دانوں سے زیادہ اہمیت دینا غلط بات ہے۔ ان لوگوں کا دائرہ الگ ہے، جس میں ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ مگر علمی اور ادبی جلسوں کو علمی و ادبی ہی رہنے دینا چاہئے، انھیں سیاسی اور کاروباری نہیں بنانا چاہئے کیونکہ ع

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

انجمن ترقی اُردو شاخ ہری ہانسی

۲۵ر مارچ کو انجمن ترقی اُردو شاخ ہری ہانسی نے "نوگوں" کے ہال میں ایک ادبی جلسہ زیر صدارت جناب ضمیر گپتے ہری ہانسی منعقد کیا۔ آغاز صدر موصوف کی ایک وطنی دقومی نظم "اے میرے وطن کے لوگو" سے ہوا۔ اس کے بعد دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے سنائے نظمیں، غزلیں اور مضامین پڑھ کر سامعین کو محظوظ کیا۔ جن میں بشیر احمد صاحب قریشی بشیر، ڈاکٹر مینگو ہری ہانسی، مسیح الدین احمد صاحب، شری راما شنکر پرشاد شنکر و دیگر علاقائی شعراء و ادباء کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاید قرب وجوار میں یہ جلسہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا جس میں بلاتفریق مذہب و ملت ہر چھوٹے بڑے نے شریک ہو کر اپنی ادب دوستی کا ثبوت دیا۔

(صدر انجمن ضمیر گپتے ہری ہانسی)

مجلس مصنفین مدراس

۱۰ر اپریل کو مجلس مصنفین مدراس کی مجلس عاملہ کا ایک خصوصی جلسہ مجلس کے صدر جناب دانش فرازی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں جنرل سکریٹری جناب راز امتیاز اور خازن جناب فرحت کیفی پر مشتمل دستور کمیٹی نے مجلس کے دستور میں بعض تبدیلیوں کی سفارشات پیش کیں۔ تقریباً دو گھنٹوں کے مباحثہ کے بعد اور معمولی رد و بدل کے ساتھ دستور کمیٹی کی سفارشات منظور ہوئیں۔ مجلس عاملہ نے نئے دستور کے تحت ضمنی قوانین بنانے کا کام بھی اسی کمیٹی کے سپرد کیا۔

نئے دستور کی منظوری کے بعد مجلس عاملہ نے سنہ ۱۹۶۳ء میں مجلس کے آئندہ ادبی اور ثقافتی پروگراموں کے بارے میں بعض بنیادی باتوں پر بحث کی اور طے کیا کہ ۶۳ء کے اواخر تک مجلس مصنفین کی جانب سے تامل ناڈ اور جنوب کے اُردو شعراء اور ادباء کی منتخب تخلیقات کا مجموعہ شائع کیا جائے۔ مجلس عاملہ نے یہ بھی طے کیا کہ مجلس کے کام کو آگے بڑھانے اور اردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کی خاطر دوسری زبانوں کے فنکاروں اور ادبی اداروں سے روابط پیدا کئے جائیں۔ مذکورہ کاروباری نشست کے بعد ایک مختصر سی ادبی نشست بھی ترتیب دی گئی جس میں ساحل رشید، دانش فرازی، کاوش بدری اور پیام سعیدی نے اپنے تازہ افکارات پیش کئے۔

(کاوش بدری، ناظم نشر و اشاعت)

سوویت ادیبوں کا وفد

ہندوستان اور سوویت یونین کے درمیان سائنسی اور ثقافتی تبادلے کے منصوبے کے تحت سوویت ادیبوں کی ایک ٹولی ۱۵ر اپریل کو دلی پہنچی۔ یہ ادیب ساہتیہ اکاڈمی کی دعوت پر ہندوستان آئے ہیں۔

انجمن تعمیر اُردو دلی

۲۴ر مارچ کو انجمن تعمیر اُردو دلی کی جانب سے ایک خصوصی ادبی نشست منعقد ہوئی۔ نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآبادی نے "دلی کے دکن پر اثرات" کے زیر عنوان تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ دکن کی اُردو اہل دلی ہی کی مرہون منت ہے۔ خواجہ بندہ نواز، شاہ نصیر، مشتاق، حفیظ اور بیان وغیرہ اساتذہ نے دلی سے جا کر ہی دکن میں علم کی شمع روشن کی۔ بشمنی دور سے بھی ... کے فرمانرواؤں نے خود کو دلی کا صوبیدار ہی سمجھا اور دلی ہی کا سکہ وہاں بھی رائج رہا۔ بہمنی، عالمگیری اور آصفیہ دور میں بے شمار اساتذہ وہاں جا کر آباد ہوئے۔ شمس الدین فیض کا اسکول حضرت مشتاق دہلوی کے فیض تلمذ سے شروع ہوا۔

(گلزار دہلوی جنرل سکریٹری)

ہمدرد منزل میں ہند و پاکستان کے شاعروں کا اجتماع

دہلی ۱۰ر اپریل۔ رات ساڑھے نو بجے ہمدرد دواخانے کے سوشل ویلفیر آفس کے زیر اہتمام ہمدرد منزل میں ایک عظیم الشان ہند پاک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب سجاد ظہیر نے کی۔ اس مشاعرہ میں پاکستان اور ہند کے مشہور اور ممتاز شاعروں نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

اُردو لائبریری چکردھرپور

ممبران اُردو لائبریری چکردھرپور نے ۱۳ر مارچ کو ظہیر الحق خاں صاحب کی صدارت میں مجلس عاملہ کے پندرہ ممبروں کا انتخاب کیا اور ۱۵ر مارچ ۶۳ء کو عبد الحکیم صاحب کی صدارت میں مندرجہ ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا: محمد تصدق حسین صاحب (صدر) حکیم محمد باقر صاحب (نائب صدر)۔ سید ہاشم حسین صاحب (سکریٹری)۔ عبد الحکیم صاحب اور محمد توحید سبحان صاحب (نائبین سکریٹری)۔ اور محبوب حسن صاحب (خازن)۔ (سکریٹری اُردو لائبریری چکردھرپور)

انجمن معین الادب سہسرام

۱۴ر اپریل کو انجمن کا ماہانہ جلسہ زیر صدارت جناب حسن سہسرامی منعقد ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ مقامی رونگٹا مڈل اسکول میں امتحانات کے سوالات صرف ہندی میں چھپتے ہیں جس سے اردو خواں طلبہ کے لئے دشواریاں ہیں، اس لئے امتحانات کے سوالات اردو میں بھی چھاپے جائیں۔ مقامی ہائر سکنڈری اسکول میں اُردو اور فارسی کی تعلیم معیاری نہ ہونے سے طلبہ کی صلاحیت گر رہی ہے جس کے پیش نظر ایک اردو کے استاد کا تقرر کیا جائے۔ آخر میں بلبل بہار علامہ سرمد کابری، علامہ شفیق جونپوری اور جواں سال شاعر و نقاد ارشد کاکوی کی وفات پر اظہار افسوس اور پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

(ظفر رضوی کاکوی ناظم اعلیٰ)

عادل منصوری

قدم اُٹھائے نوجواں

وہ اُٹھ رہی ہیں آندھیاں
جلو میں لے کے بجلیاں
مٹا نہ دے ترا نشاں
سنبھال اپنا آشیاں

ہے آج تیرا امتحاں
قدم اٹھائے نوجواں

ہوا ہے جس پہ گامزن
ہے راہ وہ بہت کٹھن
کہ راہ بر کے روپ میں
ملیں گے تجھ کو راہزن

بنا نہ کوئی رازداں
قدم اٹھائے نوجواں

ابھی نہ کر قیام چل
ہے وقت کا پیام چل
پکارتی ہیں منزلیں
کچھ اور تیز گام چل

گزر نہ جائے کارواں
قدم اُٹھائے نوجواں

چراغ دل کی لو بڑھا
نقاب تیرگی اُٹھا
یہی ہے شان زندگی
ہجوم غم میں مسکرا

نہ آہ بھر نہ کر فغاں
قدم اٹھائے نوجواں

یہ شام غم یہ تیرگی
سحر کے یہ نقیب ہیں
نہ ہو اُداس ہم نشیں
اُجالے اب قریب ہیں

یہ کہہ رہا ہے آسماں
قدم اٹھائے نوجواں

اسد احسن جعفری

اجنبی شہر سے ...

سوچتا ہوں مرے ہمدم کہ بصد پیار و خلوص
اجنبی شہر سے سوغات تجھے کیا بھیجوں

آج پھر زخم تمناؤں کے لو دیتے ہیں
لمحہ لمحہ مری تنہائی سے اُٹھتا ہے دھواں
دل کے دامن سے لپٹتی ہیں سہانی یادیں
اب بھی تازہ ہے تصور میں جدائی کا سماں

کب سے روٹھی ہیں پذیرائی کی گھڑیاں مجھ سے
اب نہ وہ پیار کی شبنم ہے نہ رس ہے نہ مٹھاس
نرمیاں دست حنائی کی نہ وہ قرب کی آنچ
چھوٹ کر تجھ سے مرا شہر تمنا ہے اداس

سخت عالم ہے ترے ہجر میں اے راحت زلف
کس سے دکھ اپنا کہوں کس سے دلاسا چاہوں
سوچتا ہوں مرے ہمدم کہ بصد پیار و خلوص
اجنبی شہر سے سوغات تجھے کیا بھیجوں

غزلیں

راہی بلند شہری

دل ہی جب ٹوٹ گیا ساز نہیں ہے نہ سہی
نغمہ ریز اب کوئی آواز نہیں ہے نہ سہی
عشق کو بھی نہیں اب فرصت آشفتہ سری
حسن کا پہلا سا انداز نہیں ہے نہ سہی
ہم نے بھی چھوڑ دیا مشغلۂ آہ و فغاں
اب کوئی گوش بر آواز نہیں ہے نہ سہی
جب ترے لب ہی غزل خوان و گل افشاں نہ رہے
میرے ہاتھوں میں اگر ساز نہیں ہے نہ سہی

یٰسین علی خاں

بجھ گئے اول شب سجدہ منزل کے چراغ
در میخانہ ہی کھلوا دو کہ کچھ رات کٹے
نوبت بیخودی جور ہے بیدار ابھی
"غمزدہ" شیشہ کو چھلکا دو کہ کچھ رات کٹے
حرف شکوہ نہ سہی نغمۂ شادی نہ سہی
قصۂ درد کو دہراؤ کہ کچھ رات کٹے
دوستو جادۂ منزل ہے فروزاں کم ہے
فکر کی مشعلیں دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

بشیر انور

اُنگلیاں تر لہو سے دل مسموم
ہے وفاؤں کا یہ نیا مفہوم
تیری الفت سے کیا ہوئے محروم
ساری خوشیاں بنیں مقسوم
فکروں دل کے کھو ان نہ سہی
کر کے خدمت سبھی ہوئے مخدوم
غم کے ماروں کا حال کیا ہوگا
تم بھی ہو جاؤ گے اگر مغموم

بے حس الہ آبادی

سا مساکن نہیر کوئی بھی آپ و منزل میرا
چمن کا ذرہ ذرہ بن چکا ہے رازداں میرا
ذرا راہ عمل میں گامزن ہونے تو دو مجھ کو
کرے گا رہنمائی خود مری عزم جواں میرا
موافق ہو گئی جس دن ہوا صحن گلستاں کی
بدل جائے گا فوراً ہی انداز فغاں میرا

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

خادمانِ اُردو

جن کے نام سے ہم آشنا نہیں!

نہ معلوم کتنی ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے عمر بھر علم و ادب کی خاموش خدمات انجام دی ہیں لیکن زمانے نے ان کے کارنامہا کو محفوظ نہیں رہنے دیا اور آج ہمیں ان کے نام تک معلوم نہیں ہیں۔ ہم نے اپنی غفلت اور بے پروائی سے علم و ادب کے ان جوہریوں کو کھو دیا اور ساتھ ہی بے شمار خادمانِ اُردو بے نام و نشان ہو کر رہ گئے۔ میں اس مختصر مضمون میں تین بنگالیوں کا ذکر کرتا ہوں جن کے نام کا ہمیں علم نہیں ہے۔ نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کون تھے؟ کہاں اور کب پیدا ہوئے اور کب ان کا انتقال ہوا۔ زبان و ادب کی انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اُس سے بھی ہم مکمل طور پر آگاہ نہیں ہیں لیکن قدیم کتابوں اور اخبارات کی ورق گردانی کرتے ہوئے چند خبروں پر ہماری نظریں جم کر رہ جاتی ہیں جن سے کسی صاحبِ علم کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون میں ایسے ہی بے نام و نشان خادمانِ اُردو کا تذکرہ کرتا ہوں:

(۱)

۳۱-۱۸۳۰ء کی اسکول بک سوسائٹی[1] کی رپورٹ میں درج ہے کہ راجہ راج کرشنا دیب[2] نے اسکول بک سوسائٹی کی کمیٹی میں اپنے ایک رشتہ دار کی لکھی ہوئی فارسی کتاب پیش کی تھی اُسے اسکول بک سوسائٹی کی کمیٹی نے پڑھا، پسند کیا اور اُس کی پانچ سو جلدیں شائع کیں۔ اس کتاب کے ایک صفحہ پر اصل انگریزی مضمون اور دوسرے صفحہ پر اُس کا فارسی ترجمہ چھاپا گیا ہے۔" افسوس کہ سوسائٹی کی رپورٹ میں مترجم کا نام درج نہیں ہے۔

(۲)

۱۹ مئی ۱۸۳۳ء کے ہفتہ وار سماچار درپن[3] سے ہمیں ایک اُردو دوست بنگالی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک اُردو کتاب کا اشتہار مذکورہ تاریخ کے اخبار میں پورے ایک صفحہ پر شائع ہوا ہے۔ لیکن اشتہار میں مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ مصنف نے ایڈیٹر کے نام لکھا ہے[4] "میں نہایت احترام کے ساتھ ہر کس و ناکس سے عرض کرتا ہوں کہ آسام میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد یہاں کے باشندے سرکاری زبان ہندوستانی (اردو) سیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اُردو ایک دیسی زبان ہے اور اس زبان کے ذریعہ ہم حاکمانِ ملک سے اپنے مطلب کو بآسانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہاں اس زبان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے لہٰذا لوگ اس سے ناواقف اور اپنے خیالات کو بہتر طور پر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ کئی لوگ اس دیسی زبان کے لوک گیت سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں، اور تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان سے لطف اٹھا نہیں پاتے اور افسوس کر کے رہ جاتے ہیں۔ چونکہ لوگ[5] اردو سیکھنے کے خواہش مند ہیں، لیکن اس کے لئے کوئی معقول کتاب نہیں ہے اس لئے ایک اچھی کتاب کی سخت ضرورت ہے جو اس کمی کو پورا کرے۔ اُردو سیکھنے کے لئے جو کتابیں ہیں وہ انگریزی فارسی یا ناگری میں ہیں جس کی وجہ سے یہ تصانیف عالم لوگوں ہی کے کام آتی ہیں اس لئے عوامی بھلائی چاہنے والے کئی افراد کی رائے ہے کہ اُردو سیکھنے کے لئے ماہرِ زبان ہندوستانی شری جان گلکرسٹ[6] نے جو کتابیں انگریزی اور ہندی میں لکھی ہیں اور جن میں کہیں کہیں دونوں زبانوں کے بہترین نمونے درج ہیں ان ہی کی طرح ایک کتاب بنگالیوں کے لئے بنگلہ رسم الخط میں لکھی جائے اور اُردو الفاظ کے معنی بنگلہ میں سمجھائے جائیں۔ میں نے اس کام کے لئے مختلف تصانیف نظم و نثر کی مدد سے ایک مختصر کتاب "ہندوستانی گرامر اور ابھی دان" کے نام سے مرتب کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری اس کوشش سے بنگالی جاننے والے اُردو سیکھ سکیں گے اور اس طرح ان کی بھلائی ہو گی۔"

مندرجہ بالا خط کے بعد مصنف نے مختلف کتابیں جن کی مدد سے اس نے اپنی تصنیف کو مکمل کیا ان کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کتاب سے مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً "خرد افروز" کے ترجمے سے حسب ذیل اشعار کہ اس کے معنی بنگلہ میں سمجھائے ہیں۔

> اُمید کہ یہ نامہ گرامی ہوئے ۔۔۔ آرائش بزم و شاد کامی ہوئے
> گر ہوئے تو بندۂ امیر دوراں ۔۔۔ پاوے وہ نام جس سے نامی ہوئے

مصنف مزید لکھتا ہے "سب سے پہلے جان گلکرسٹ کی تصنیف "بہار گلشن" کا (جو ۱۸۰۳ء کی تصنیف ہے) بنگلہ میں ترجمہ کیا جائے گا

---

[1] اسکول بک سوسائٹی ۴ جولائی ۱۸۱۷ء کو کلکتہ میں قائم ہوئی۔ یہ ادارہ اسکولوں کے لئے کتابیں تصنیف کرنے، شائع کرنے اور تقسیم کرنے کا کام انجام دیا کرتا تھا۔

[2] راجہ راج کرشنا دیب بہادر تخلص راجہ، شوبھا بازار راج خاندان کے فرد تھے اور مہاراجہ ناکرشنا بہادر کے لڑکے تھے۔ آپ کی کلیات پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ کا مشہور شعر ہے: ؎

> گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب
> تو ہم کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

[3] سماچار درپن۔ بنگلہ زبان کا ہفت روزہ تھا جو سری رامپور مشن والوں نے جاری کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر جے سی مارش مین تھے اور اس کا پہلا شمارہ ۲۳ مئی ۱۸۱۸ء کو نکلا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے حالات معلوم کرنے والوں کے لئے یہ بہترین ماخذ ہے۔ اس اخبار کا ایک فارسی ایڈیشن بھی "اخبار سری رامپور" کے نام سے ۱۸۲۶ء میں جاری ہوا تھا۔

[4] اس طویل اشتہار میں فارسی یا اُردو کے جو اشعار و جملے مصنف نے نمونے کے طور پر دیئے ہیں وہ اُردو ٹائپ میں چھاپے گئے ہیں اور باقی مضمون بنگلہ ٹائپ میں ہے۔

[5] "لوگ" سے یہاں مصنف کا مطلب بنگالیوں سے ہے۔

[6] جان گل کرسٹ، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ہندوستانی (اردو ہندی) ڈپارٹمنٹ کے صدر تھے۔

اور اُردو میں یہی جملے دیئے جائیں گے، جس کا نمونہ یہ ہے:

Can you speak our language

تُمی آمار بھاشا کہی تے پارو (بنگلہ)
تم ہماری زبان بول سکتے ہو (اُردو)

Yes, I can speak a little English

ہاں آمی انگراجی کچھو کچھو کہی تے پاری (بنگلہ)
ہاں میں انگریزی کچھ کچھ بول سکتا ہوں (اُردو)

آگے چل کر مصنف لکھتا ہے کہ کتاب کے دوسرے حصے میں *Oriental fabulist اور دیگر مشہور تصانیف کے تراجم پیش کئے جائیں گے۔ تیسرے حصے میں صرف "اردو" نامی کتاب کا بنگلہ ترجمہ ہوگا لیکن اس تیسرے حصے میں دیگر مثالیں بھی ہوں گی۔

مصنف اُردو زبان کی ترقی کا کتنا خواہش مند تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اشتہار کے آخر میں کہا ہے کہ "جو علم کے قدردان ہیں اور کتاب کی حفاظت کرتے ہیں انھیں کتاب مفت دی جائے گی۔ لیکن جو علم کے قدردان نہیں ہیں اور محض کسی اور وجہ سے کتاب لینا چاہتے ہیں ان سے قیمت لی جائے گی۔"

(۳)

نامعلوم سی ایک شاعر خاتون ہیں۔ قدیم بنگلہ اخبارات کی بعض خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ وقت کی مشہور عالم اور شاعرہ تھیں اور آپ کو اُردو سے بے حد لگاؤ تھا۔ لیکن افسوس کہ ان اخبارات میں آپ کے کسی شعر یا کسی تصنیف کا نہ تو تذکرہ کیا گیا ہے، اور نہ نام ہی لکھا گیا ہے۔ ہر خبر میں صرف "ستوش دیب کی بیٹی" ہی لکھا گیا ہے۔

ستوش دیب بنگال کے مشہور رئیس تھے، جن کا انتقال جنوری ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ ان کی موت کی اطلاع یکم فروری ۱۸۵۶ء کے اخبار "سنباد پربھاکر" میں ہے۔ ستوش دیب علم دوست ہی نہیں بلکہ خود عالم، اچھے شاعر اور گیت کار بھی تھے۔ ان ہی کی علم دوستی کا سایہ ان کی دختر نیک اختر پر بھی پڑا تھا۔ ۳۱ مئی ۱۸۴۹ء کے اخبار "سنباد بھاسکر" نے لکھا ہے: "موجودہ دور میں شری ستوش دیب کی نیک بیٹی کے ذوق علم و ادب کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ ستوش دیب کی یہ دختر نیک اختر بنگلہ، اُردو اور برج بھاشا پر عبور رکھتی ہے اور اس کی دیوناگری کی قابلیت کو دیکھ کر بڑے بڑے پنڈت بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ ہم نے اس کی چند مختلف تخلیقات جمع کی ہیں اور ہم لوگوں کے سامنے وہ تخلیقات پیش کر سکتے ہیں۔"

---

* Oriental fabulist فورٹ ولیم کالج کے کورس کی کتاب تھی۔ اس کا اردو ترجمہ منشی تارینی چرن مترا، میر بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس اور مولوی امانت اللہ نے مل کر کیا تھا۔ تارینی چرن مترا کے سلسلے میں مزید معلومات کے لئے میرا مضمون ماہنامہ "آج کل" دہلی دیکھئے۔

بقیہ

کلامِ ذوق میں الحاق

ان اشعار کو اور ان کی تمہید کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ آزاد نے واقعی کس قدر دیدہ ریزی اور جانکاہی سے استاد ذوق کا کلام جمع کیا ہے۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ اشعار خود آزاد کے دیوان میں دیکھتے ہیں اور اس طرح

نامۂ شوق کو مرے باندھئے اگر تو بال پر
کیوں ہوئے مرغ نامہ بر تجھ کو ترے وبال پر
مصحف روئے یار میں ہو ہے جو دیکھا خال پر
لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم خط میں چنے کی دال پر

کیا یہ صحیح ہے کہ وہ "مجہول آدمی" خود آزاد ہی ہے جس نے یہ اشعار دیوان ذوق میں لکھے؟ خیر پوری غزل سنئے:

سبزۂ خط کے شوق میں دل نہیں اپنے حال پر
طائر دل ہوا اڑ رہا ہے ورق خیال پر
شوق تو دل کا لے پری دیکھ کے گل کے کان میں
بیٹھا فسانہ کہتا ہے گلبن نونہال پر
صید فگن کدھر کو ہے دیکھو تو آگے مرغ دل
لپٹے ہوئے قفس کو ہیں لوٹ رہے ہیں جال پر
وحشت جنوں میں قیس کو خاک بھی ہے نہ سر پہ
منت قاصد صبا لیتا ہے بال بال پر
چھوڑ دے خط کو ہاتھ سے ذوق پہنچ رہے گا یہ
اس کو صبا اڑا کے لے گی ہوں گے ترے خیال پر

(مجموعۂ نظم آزاد، مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۸۹۹ء، مرتبہ مولوی سید ممتاز علی صفحہ ۱۱۲)

اور بھی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ غزل میں تخلص ذوق کا ہے، اس موقع پر ایک واقعہ ذہن میں رکھیں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔

"ایک بار کوہ نور کے ایڈیٹر سے آزاد نے کہا کہ میں نے اس دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی ہے۔ الزام یہ ہے کہ میں خود غزلیں کہہ کر استاد کے نام سے شائع کرتا ہوں اگر ایسا ہوتا تو خود اپنے نام سے شائع کرتا۔"

اگر آزاد پر وہ الزام غلط تھا تو ان کے دیوان میں غزل مذکور کے ہونے کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ واضح رہے کہ سید ممتاز علی آزاد کے ارشد تلامذہ میں ہیں ان کو اگر شبہ بھی ہو گیا ہوتا کہ یہ غزل آزاد کی نہیں تو وہ اسے ان کے دیوان میں شامل نہ کرتے۔ بات ایک ہی غزل کی نہیں، غزلیں اور بھی ذوق تخلص کی مجموعۂ نظم آزاد میں کئی ہیں حاضر ہیں:

گر تصور میں نکلا وہ خط جاناں ہوگا
پھر تو جو خط میں لکھا ہے وہ عیاں ہوگا

ہاتھ چومیں گے مرے گبر و مسلماں دونوں
ایک میں دست صنم ایک میں قرآں ہوگا
غنچۂ دل کو مرے توڑ کے خوش ہوتے ہو کیا
وہ بھی گل ہے کہ جو پھولا تو گلستاں ہوگا
دل نہیں ہے تو نہ ہو دیکھو تو سینہ میں ہے کون
مجھ سا دلدادہ بھلا کوئی مری جاں ہوگا
دل ہے اپنا کہ جہاں ہوتے قدم خاک ہے یہ
یا کسی زلف میں ہوگا تو پریشاں ہوگا
بارِ تسلیم ہوا پیش کہ دیکھو اس کو
کون سمجھا تھا اُٹھائے گا تو انساں ہوگا
ذوق کا دل ابھی روتا ہے ابھی ہنستا ہے
زیرِ شبنم کہیں دیکھا گل خنداں ہوگا (صفحہ ۱۱۳)

رات سونے کے لئے تھی اب ہے رونے کے لئے
دن رہا باقی سو ہے وہ جان کھونے کے لئے
ناخدائی کی وہیں ہوج تبسم نے تری
گریہ جب آیا مری کشتی ڈبونے کے لئے
چشم کے چشموں پہ میرے مردمِ دیدہ نہیں
پتلیاں بیٹھی ہیں دو موتی پرونے کے لئے
ذوق جو کشت امل تھی ہو گئی سرسبز یاں
اب ہے کیا باقی جو پھر آئیگے بونے کے لئے (صفحہ ۱۱۵)

یہ تو چند مثالیں ہیں، ورنہ دیوانِ ذوق میں اس قبیل کے الحاقی اشعار اور بھی مل سکتے ہیں، ان کے محرکات کا تفصیلی مطالعہ یقیناً ایک اہم کام ہوگا لیکن جتنا اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔

سہ لسانی فارمولا میں سنسکرت شامل نہیں کی جاسکتی

وزرائے تعلیم کی جو کمیٹی سہ لسانی فارمولا پر عمل درآمد کی نگرانی کے لئے بنائی گئی ہے اس میں اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا ہے کہ ثانوی اسکولوں سے نکلنے والے طلبہ کو کم سے کم تین زبانوں سے قرار واقعی واقفیت ہونی چاہیئے ایک علاقائی یا مادری زبان، دوسرے ہندی یا کوئی دوسری ہندوستانی زبان اور تیسرے انگریزی۔

معلوم ہوا ہے کہ کمیٹی نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس فارمولا پر پورے ملک میں عام طور پر اس ڈھنگ سے عمل درآمد کیا جائے جو پہلے طے ہو چکا ہے لیکن تمام ریاستوں کے طریق کار میں مکمل یکسانیت نہیں ہو سکتی اور بعض باتوں میں ان کے طریقے الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

کمیٹی نے ہندی والے علاقوں کے لئے یہ طے کیا کہ چونکہ ہندی پہلی زبان کی حیثیت میں آجاتی ہے اس لئے فارمولا کے تحت دوسری زبان کی جگہ کسی اور ہندوستانی زبان کو ملنا چاہیئے دی جاتی ہے کہ کسی کلاسیکی زبان مثلاً سنسکرت کو جو ہندی سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔

یونانی ڈرامہ اُردو میں

قدیم یونانی ڈرامہ "اینٹی گونی" کو اُردو روپ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کے لئے نیشنل اسکول آف ڈرامہ یقیناً قابل مبارکباد ہے۔

انوئیل کے فرانسیسی ترجمہ کو بنیاد بنا کر وصی خاں نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے لیکن بڑی حد تک یہ ترجمہ سوفوکلیس (SOPHO CLES) کے اصل متن سے نزدیک تر ہے جو سوفوکلیس نے تقریباً ۴۴۲ ق م میں تصنیف کیا تھا۔

اس پیش کش کی کامیابی کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ علم ہو جائے کہ اس کہانی کے کردار کو ادا کرنے والے سب ڈرامہ اسکول کے دوسرے سال کے طالب علم ہیں۔ (عوامی دور)

راہل سنکرتائن کا انتقال

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۱۴ر اپریل کو ہندوستان کے مشہور مصنف اور عالم راہل سنکرتائن کا دارجلنگ میں انتقال ہو گیا۔ راہل جی کو سنسکرت، پالی اور ہندی پر پورا عبور تھا۔ وہ مورخ ہونے کے علاوہ مشرقی فلسفے کے عموماً اور بدھ فلسفے کے خصوصاً بہت بڑے ماہر تھے۔

راہل جی چھوٹی بڑی ایک سو ستر کتابوں کے مصنف تھے ساہتیہ اکیڈیمی نے ۱۹۵۸ء میں ان کی کتاب "مدھ ایشیا کا اتہاس" کو پانچ ہزار روپے کا قومی انعام بھی دیا تھا۔ انتقال کے وقت انکی عمر ستر سال تھی۔

اُردو کی پہلی ڈائری

انڈیا آفس کے کتب خانے میں کریم خاں والی جھجر کے سفر انگلستان (۱۸۴۰ء-۱۸۴۱ء) کی ایک قلمی ڈائری محفوظ ہے، جو حال ہی میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ملی ہے، اور ان کے بیان کے مطابق یہ اُردو کی پہلی ڈائری ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۳۹ء میں کریم خاں کو اپنا وکیل بنا کر انگلستان بھیجا تھا۔ ۲۷ر جولائی ۱۸۴۰ء کو وہ لندن پہنچے اور ۱۸۴۱ء تک وہاں مقیم رہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بیان کے مطابق "کریم خاں" نے اپنے سفر کے دلچسپ حالات ڈائری کی صورت میں لکھے ہیں۔ اس ڈائری میں روزانہ کی مصروفیات کی تفصیل ہے۔ اس تفصیل سے نہ صرف ایک ایسے شخص کی ذہنی و جذباتی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جو سات سمندر پار کرکے ایک اجنبی دیس میں پہنچتا ہے بلکہ اس زمانے کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے نشیب و فراز کی تصویر بھی سامنے آتی ہے، اور ہندوستان اور انگلستان کے تعلقات کا علم بھی ہوتا ہے۔

یہ ڈائری کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اتنی دلچسپ ہے کہ ایک دفعہ شروع کرکے اس وقت تک چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا جب تک اس کو ختم نہ کر لیا جائے۔ انگلستان میں مجھے اس ڈائری کا قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

میرے خیال میں یہ اُردو کی پہلی ڈائری ہے۔ اس سے قبل اردو میں کوئی اور ڈائری نہیں لکھی گئی۔ یادداشتوں اور نوٹوں کی صورت میں ایک آدھ چیز ضرور مل جاتی ہے لیکن اس کو ڈائری نہیں کہا جا سکتا۔ باقاعدہ لکھی ہوئی ڈائری یہی ہے جس میں ڈائری کے اصولوں کو بھی بڑی حد تک پیش نظر رکھا گیا ہے۔

شاہ نامۂ فردوسی

شاہ نامۂ فردوسی، تاجک سائنس اکاڈمی کی طرف سے ۹ جلدوں میں شائع ہوگا۔ خیال ہے کہ شاہ نامہ کا یہ دنیا میں سب سے زیادہ مکمل ایڈیشن ہوگا۔ اس کی تیاری کے لئے مرتبین نے ماسکو، لینن گراڈ، دوشنبے اور تاشقند کے قدیم نسخوں کے علاوہ برٹش میوزیم کے نسخے کو بھی سامنے رکھا ہے جس کی فوٹو اسٹاٹ کاپی منگوائی گئی تھی۔ اس کی ترتیب ایک تاجک محقق عینی کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔

مراسلات

"میر کا غیر مطبوعہ مرثیہ" یا سلام؟

خدائے سخن میر تقی میر کے مرثیوں کے متعلق پہلے صرف روایتیں سُنی جاتی تھیں لیکن آج ان کے ۳۹ مرثیے اور سلام منظرِ شہود پر آچکے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی کی خدمت لائق ستائش ہے کہ انھوں نے میر کے ایک غیر مطبوعہ کلام سے اُردو والوں کو متعارف کرنے کی کوشش کی اور "ہماری زبان" مورخہ یکم اپریل ۱۹۶۳ء میں ان کا ایک اور غیر مطبوعہ "مرثیہ" شائع کیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کو ایک غلط فہمی بھی ہوئی ہے۔ پیش نظر مرثیہ اصل میں سلام ہے۔ مرثیے کے لئے جب تک مسدس کی شکل مخصوص نہیں ہوئی تھی اس وقت تک سلام کے لئے بھی غزل کی شکل کی قید نہ تھی بلکہ جس نظم میں امام کو براہ راست خطاب کیا جائے یا ان کے لئے درود و سلام کے الفاظ استعمال کئے جائیں وہ سلام سمجھی جاتی تھی۔ خواہ وہ مربع ہو یا مخمس یا مفردہ۔ (جعفر رضا)

غالب کی ایک اصلی تحریر

غالب کے خطوط اُردوئے معلّی وغیرہ میں ایک خط منشی حبیب اللہ ذکا کا موسومہ شامل ہے۔ خط کا آغاز یہ ہے:

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں ...

اس خط کا اختتام حسب ذیل عبارت پر ہوا ہے۔

"منشی حبیب اللہ ذکا سخنور ہمہ داں یکتا لفظ طراز معنی آفریں۔ آفریں صد آفریں صد ہزار آفریں"

یہ اصلی تحریر جو مرزا غالب کی خود قلمی ہے جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے کتب خانہ کے ایک فارسی مخطوطہ خاش و خاشاک میں درج ہے۔ تحریری پنجہ غالب کی مہر ہی ثبت ہے۔ خاش و خاشاک حبیب اللہ ذکا کی تصنیف ہے۔ زمانہ کے انقلابات سے حبیب اللہ ذکا کا ذاتی نسخہ کتب خانہ نظامیہ میں آگیا ہے۔

اس خصوص میں زین العابدین صاحب معتمد جامعہ نظامیہ ایک مضمون قلمبند فرما رہے ہیں جو خط کے فوٹو کے ساتھ کسی معیاری رسالہ میں شائع کیا جائے گا۔

(نصیر الدین ہاشمی)

نظم "میرا دل" کس کی ہے؟

"نقش" کراچی کے پچھلے شمارے میں ساحل مانکپوری کی نظم "میرا دل" نظر سے گذری جو کہ ہفتہ وار "ہماری زبان" سے منتخب کی گئی تھی۔ ساحل صاحب اڈیٹر "آہنگ" مجھ سے الٰہ آباد میں میری دو نظمیں "یہ بچے" اور "میرا دل" مانگ کر لے گئے کہ "آہنگ" میں شائع کروں گا۔ اور "میرا دل" اپنے نام سے "ہماری زبان" میں شائع کرا دیا۔ یہ نظم میں الٰہ آباد میں ڈاکٹر اعجاز صاحب اور شبنم نقوی کو سعید سہروردی، ڈاکٹر اعجاز صاحب اور شبنم نقوی کو سنا چکا ہوں۔ یہ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ یہ میری تخلیق ہے اور "یہ بچے" سنہ ۶۰ء انجمن ترقی پسند مصنفین میں سُنا چکا ہوں۔ ساحل صاحب نے "میرا دل" ہماری زبان میں شائع کرا دیا۔ اب دیکھیں "یہ بچے" کہاں شائع کراتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر ساحل صاحب دو مصرعے موزوں کر دیں تو میں شاعری چھوڑ دوں گا۔

(افتخار اعظمی)

راس مسعود کا انتخاب زریں

ہماری زبان مورخہ ۸ر اپریل ۶۳ء میں تنویر بدایونی کے متعلق جناب اختر علوی صاحب وارثی کا ایک نوٹ شائع ہوا ہے اس میں انہوں نے انتخاب زریں مرتبہ سر سید راس مسعود صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی طباعت شاہی برقی پریس حیدرآباد میں تحریر فرمائی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب سوائے نظامی پریس بدایوں کے اب تک کہیں اور نہیں چھپی۔ اس کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۱ء میں اور آخری چوتھا ایڈیشن سنہ ۱۹۵۲ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ اس کے دیکھنے سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وارثی صاحب نے ان کا سنہ وفات ۴۳ء غلط تحریر کر دیا۔ اسی طرح ان کی قبر کا مقام بھی ٹھیک نہیں دیا۔ انتخاب زریں میں سنہ وفات نومبر سنہ ۱۹۱۲ء اور قبر کا مقام درگاہ حضرت سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیرونی چبوترہ درج ہے۔ ۱۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو وہ بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔

وارثی صاحب کے بیان سے آیندہ لکھنے والوں کو مغالطہ ہو گا اس لئے آئندہ پرچے میں آپ اس کی تصحیح فرما دیں تو بہتر ہو گا۔

(احمد الدین نظامی ایڈیٹر اخبار ذوالقرنین بدایوں)

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

مولانا قمر الدین احمد قمر بدایونی

قمر الدین احمد نام، آپ کے والد حاجی مولوی ضیاء الدین محمد بن ابو بکر کی اولاد سے صدیقی ہیں۔ آپ کے اجداد پہلے مصر کے قصبۂ فرشور میں آباد تھے جو قاہرہ کے قریب قدیم بستی ہے۔ یہاں سے آپ کے بزرگ ہندوستان میں آئے اسی لئے فرشوری کہلائے۔ صدیق اکبر کی اٹھارھویں پشت میں ایک بزرگ تھے جو دربار مغلیہ سے سرفراز ہو کر نواب فصیح اللہ خاں کہلائے ان کے بیٹے نواب ابو المؤید خاں ہوئے۔ خانی کا خطاب ان لوگوں کو محمد شاہ بادشاہ ہند نے دیا تھا۔ بدایوں، دہلی اور پانی پت میں جاگیریں دی تھیں۔ نواب فصیح اللہ خاں کے پوتے محمد اساس الدین تھے۔ اساس الدین کے بیٹے عزیز الدین منصف تھے جو شاگرد غالب تھے۔ یہ اس زمانہ میں دہلی میں وکالت کرتے تھے۔ خطوط غالب میں ان کا تذکرہ ہے۔ پہلے عزیز تخلص تھا پھر صادق کر لیا۔

عزیز الدین کے بیٹے ابو الحسن صدیقی سر سید کے پرائیوٹ سکریٹری تھے اور کافی عرصے تک حیدرآباد دکن میں جج رہے تھے۔ مولوی عبد الحق کے ہم عصر، دیوان حافظ کے حافظ صاحب تصانیف۔ عزیز الدین کے چھوٹے بیٹے حاجی ضیاء الدین تھے جو جج کی عدالتوں کے ناظر رہے ہیں۔ نہایت نیک طبیعت مرنجان مرنج اور دین دار شخص تھے۔ ان حاجی مرحوم کے بڑے بیٹے قمر الدین احمد ہیں۔

قمر الدین احمد ۲ر جولائی ۱۹۰۱ء کو اپنے آبائی مکان فرشوری ٹولہ میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ نشو و نما زیادہ تر آپ کی والدہ کی نگرانی میں ہوئی چونکہ آپ کے والد بوجہ ملازمت باہر شہروں میں رہتے تھے۔ قمر الدین احمد نے نویں تک بدایوں گورنمنٹ اسکول میں تعلیم پائی اس کے بعد ہائی اسکول شاہجہاں پور سے پاس کیا۔ ایف اے بریلی کالج سے، بی اے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے، بی ٹی علی گڑھ سے۔ فارسی کا شوق بی اے میں فارسی لینے کی وجہ سے اور الہ آباد کے سردار محمد عمر خاں اور عبد الرشید خاں افغان شہزادوں کے ٹیوٹر ہونے کی وجہ سے بہت بڑھ گیا ہے۔ نثر نویسی کا شوق آپ کے تایا صاحب ابو الحسن کی صحبت سے پیدا ہوا۔ نظم میں دخل ننہیال سے حاصل ہوا۔ مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا شبلی کی تصنیف کے مطالعہ نے ایک اسلوب بیان معین کر لیا۔ فارسی، اردو کلام پر غائر نظر ڈالی۔ اپنے ماموں تولا حسین تولا مرحوم کے کلام کو اور سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے کلام کو بہت شوق سے پڑھا اور تنقیدی نظر سے پیش کیا۔ تنقید اور تبصرہ میں اپنے خسر قاضی غلام امیر نقاد سے رہبری پائی۔

بی۔ اے کے بعد ہائی کورٹ میں مترجم ہوئے اور پھر ماڈرن ہائی اسکول الہ آباد میں بحیثیت مددگار بھی کام کیا۔ چند سال بعد مدرسہ آصفیہ کی ہیڈ ماسٹری نے کھینچ بلایا۔ تصنیف تالیف کا سلسلہ وہیں پڑا۔ گلبرگہ کے گورنمنٹ شورہ پور ہائی اسکول کی پرنسپلی سے بحیثیت پنشنر ریٹائرڈ ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں وہاں سے وطن آکر اسلامیہ کالج بدایوں میں مددگار پرنسپل، سپرنٹنڈنٹ ٹریننگ اسکول، پرنسپل نگلہ ہائی اسکول، پرنسپل ککرالہ ہائی اسکول کی حیثیت سے بدایوں میں علمی خدمت کی۔ مولانا ضیاء احمد کی معیت میں لغت اردو کا کام کرنے کے لئے علی گڑھ گئے اور لغت پر کچھ عرصہ تک کافی محنت کی مگر یہ کام سرکاری مدد بند ہو جانے کی وجہ سے بند ہو گیا تو آج کل بدایوں میں مقیم ہیں اور علمی و ادبی کاموں میں وقت گزاری کر رہے ہیں۔

قمر الدین احمد حسب ذیل تصانیف کے مصنف ہیں:

(۱) "بزم اکبر" جس کے متعلق مولانا عبد الحق مرحوم نے ان کو خط لکھا کہ "آپ کی کتاب کو مقدمہ کی حاجت نہیں"۔ اکبر الہ آبادی کی حیات اور شاعری کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ اردو ادب کے ہر طالب علم کو ضروری ہے۔ یہ کتاب علی گڑھ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی مدارس کے نصابوں میں بی اے اور ایم اے میں داخل رہی ہے۔ اس کتاب کو سب سے پہلے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (حیدرآباد دکن) نے شائع کیا تھا۔

(۲) "لمعات قمر" یہ آپ کی متفرق منظومات کا مجموعہ ہے اس میں غزلیں، رباعیاں اور دوسری اصناف سخن ہیں۔ یہ مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

(۳) "محفل عزیز" مولوی عزیز مرزا کی حیات ہے جو سر سید محسن الملک اور وقار الملک جیسے مصلحین کی طرح علی گڑھ کالج کی چوتھی اہم کڑی تھے۔ اس کتاب کو مولوی عزیز مرزا کے فرزند مولوی سجاد مرزا صاحب سکریٹری وزیر تعلیمات کے ارشاد پر آپ نے مکمل کیا۔ پہلا حصہ ۱۹۴۱ء میں انتظامی پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا ہے اور یہ کتاب حیدرآباد بک ڈپو توپ کا سانچہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

(۴) "سوانح فصیح" خان بہادر مولوی فصیح الدین بدایونی کی لائف کا اردو میں ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔

(۵) "وفاداری بشرط استواری" یہ ایک افسانہ ہے جو ڈکنس کی مشہور ناول (A Tale of Two cities) کا ترجمہ ہے۔

(۶) "تاریخ التعلیم" یعنی یورپین تعلیم کی تاریخ ہے جو بی ٹی کے کورس میں پڑھائے جانے کے قابل ہے۔

(۷) "منصوبی طریقۂ تعلیم" یہ طریقۂ تعلیم پہ ایک مختصر کتابچہ ہے جس کو لاہور کے ناشرین نے شائع کیا ہے۔

(۸) "کشکول قمر" یہ اردو، فارسی، ہندی اشعار کا ایک رجسٹر سائز کاپی پر مجموعہ ہے جس میں درجنوں عنوانات کے تحت سیکڑوں اشعار دئے گئے ہیں جو شعراء، ناقدین اور مورخین کے لئے بڑی مدد کی چیزیں ہیں۔

آپ نے نثر میں جو کچھ باتیں پیش کی ہیں وہ ذاتی طور پر حکیمانہ نظر ڈال کر غور و فکر کے ساتھ پیش کی ہیں چونکہ دل سے نکلی ہیں اس لئے دل پر اثر کر جاتی ہیں۔ اس اثر کو بڑھانے والی دو چیزیں اور ہو گئیں، ایک آپ کا اسلوب بیان، دوسرے نثر کو پُر تاثیر بنانے کے لئے مولانا شبلی، حضرت جگر بریلوی اور مولانا ابو الکلام آزاد کی طرح جگہ جگہ پہ برمحل اشعار جو تاثیر کو اُٹھا کر عرش تک پہنچا دیتے ہیں۔ آپ نے اکبر پہ پہلے قلم اُٹھایا اس لئے کہ ان کو تمام شعراء کے مقابلے میں بڑا اونچا معلم اخلاق پایا۔ آپ کی کتاب بزم اکبر کا کہیں سے مطالعہ کر جائیے لیکن مولانا حالی کی یادگار غالب کی طرح اس میں ہیرو ورشپ (Hero worship) نظر نہیں آئے گی بلکہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی قمر صاحب نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ قمر صاحب نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں ان مضامین میں ہندوستان کے ادب کی فضا نظر آتی ہے۔ انہوں نے انگریزی قاعدوں کا سہارا نہیں لیا ہے بلکہ ہندوستانی شاعری کو ہندوستانی ماحول میں پرکھا ہے۔

جناب قمر کا شمار بدایوں کے اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ آپ غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اپنا کلام مشاعروں میں بہت کم سناتے ہیں مگر سننے کے لئے بڑی اونچی صلاحیت پائی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

اس دوا و فکر سے اے چارہ گر کیا فائدہ
حال دل اُن سے کوئی کہتا مگر کیا فائدہ

ابرو پہ بل ہے آنکھ چرائے ہوئے سے ہیں
آئے بھی ہیں جو وہ تو نہ آئے ہوئے سے ہیں
بیٹھے ہیں یوں کہ جیسے کسی فکر میں ہیں غرق
پھر بھی تمام بزم پہ چھائے ہوئے سے ہیں

حسن سر بازار کو کیا دیکھ رہا ہے
غافل تری نظروں کو خدا دیکھ رہا ہے

بتوں سے دل میں نفرت آ رہی ہے   جوانی آج شاید جا رہی ہے

تلاش میں ہیں گریزاں وجود کے ذرات
کہاں سے آئے کہاں جائیں گے خدا معلوم

میں جانتا ہوں نہیں جام میں ہے ساقی
نہ چھین ہاتھ سے ظالم ابھی ہے جو باقی

واعظ کی حالت ظاہر سے نہ سمجھ کہ یہ اصل حالت ہے
لب اس کے ورد میں جنباں ہیں اور دل لبریز خیانت ہے

مالک انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا